تحریر: پروفیسر مولانا محمد علم الدین سالک
ترتیب: پروفیسر احسان الٰہی سالک

شاہی مسجد لاہور

شاہانِ اسلام کی ان غیر فانی عمارات میں جنھیں عوام کی طرف سے بقائے دوام کی سند مل چکی ہے، شاہی مسجد لاہور کو بہت بڑا درجہ حاصل ہے۔

یہ مسجد، قلعہ لاہور کے عین مغرب میں ایک رفیع الشان چبوترے پر کھڑی ہے جو سطح زمین سے بہت بلند ہے۔ مسجد کے مشرقی دروازے میں داخل ہونے سے پیشتر بائیس سیڑھیاں طے کرنی پڑتی ہیں۔ ان میں سب سے نچلی سیڑھی کا طول ۸۹ فٹ ۱ انچ ہے اور سب سے اوپر والی سیڑھی کوئی ۱۰۰ فٹ لمبی ہے۔ ان سیڑھیوں کی ساخت میں کابلی سنگ ابری استعمال کیا گیا ہے۔ مشرقی دروازہ اپنی شان و شوکت اور رفعت کے لحاظ سے بے عدیل ہے۔ یہ تمام و کمال سنگِ رخام اور سنگِ مرمر سے بنا ہوا ہے۔ دروازے کی محراب کے دونوں جانب خوب صورت کنگرے ہیں جو سنگِ سرخ اور مرمر کے بنے ہوئے ہیں۔ دروازوں کے عین وسط میں محراب کے اوپر سنگِ مرمر کا ایک عمدہ تختہ نصب ہے جس پر کلمہ طیبہ منقوش ہے، اور اس کے نیچے مندرجہ ذیل عبارت بہ خطِ طغرا کندہ ہے:

مسجد ابو مظفر محی الدین محمد عالم گیر پادشاہ غازی

۱۰۸۴ھ باہتمام کمترین خانہ زادان فدائیخان کوکہ اتمام یافت

یہ مسجد عالم گیر کے حکم سے مکہ معظمہ کی مشہور و معروف مسجد الولیہ کے نمونے پر تیار کی گئی تھی۔ منشی سجان رائے بٹالوی اپنی مشہور تاریخ، خلاصۃ التواریخ میں رقم طراز ہے کہ اس عمارت پر کم و بیش چھ لاکھ روپے صرف ہوئے تھے۔ مسجد کے اخراجات کے لیے ملتان کا خراج مسجد کے لیے وقف کر دیا گیا تھا۔

دروازے کی محراب کا طول ۶۷ فٹ ہے۔ اس میں گزرنے کے بعد ایک وسیع اور پر شکوہ میدان نظر آتا ہے جس کا طول شمالاً جنوباً ۵۳۰ فٹ اور عرض شرقاً غرباً ۵۲۱ فٹ ہے۔ اس کا فرش پختہ اینٹوں سے بنا ہوا ہے اور نمازیوں کی سہولت کے لیے سنگِ موسیٰ اور سنگِ رخام سے مصلے بنے ہوئے تھے جن میں حوادثِ زمانہ اور سکھوں کی تاخت و تاراج نے بالکل مٹا دیا ہے۔ تاہم جو باقی ہے وہ اس وقت کی نفاست

کا نقشہ پیش کرتا ہے۔

اس صحن کے عین وسط میں مربع شکل کا ایک حوض ہے جس سے تھوڑے ہی فاصلے پر بجانب غرب پیتل کی بنی ہوئی ایک خوش وضع لالٹین ایستادہ ہے جسے لارڈ کرزن نے اپنی طرف سے ہدیۃً مسجد ہٰذا کے متولی کی خدمت میں پیش کیا تھا، اس سے آگے بڑھو تو مسجد کی اصلی عمارت شروع ہوتی ہے، جو تین سفید گنبدوں پر مشتمل ہے۔ مسجد کی چھت نہایت خوب صورت اور منقش ہے۔ اس کی دیواروں پر مختلف قسم کے پتھروں سے نقش و نگار کیے ہوئے ہیں۔

مسجد کی تمام عمارت قالبوتی ہے۔ اس میں لکڑی کا نام و نشان نہیں۔ سب سے بڑے اور درمیانی گنبد کے نیچے سنگ مرمر کا بنا ہوا ایک خوب صورت منبر ہے جس پر خطیب جمعہ اور عیدین کے دن خطبہ پڑھتا ہے۔ مسجد کے چاروں کونوں پر چار بلند مینار کھڑے ہیں جو سب پوری سرخ پتھر سے بنے ہوئے ہیں اور میلوں سے نظر آتے ہیں۔ یہ مینار مقبرہ جہانگیر کے میناروں سے کچھ عجیب و غریب نسبت رکھتے ہیں اور اس طرز سے بنائے گئے ہیں کہ اگر مقبرے کے کسی مینار پر چڑھ کر شاہی مسجد کے میناروں کو دیکھا جائے تو وہ چار کی بجائے تین نظر آتے ہیں اور ایک ضرور اوجھل رہتا ہے۔ ان میناروں کی چار چار منزلیں تھیں، اوپر والی منزل پر گنبد دار چھت تھی مگر ۱۸۴۰ء کے زلزلے سے اوپر کی منزلیں ناکارہ ہوگئیں، اس لیے ان کو مجبوراً گرانا پڑا۔ موجودہ صورت میں ہر مینار کی بلندی ۱۴۴ فٹ ہے اور باہر کی طرف سے ان کا دور ۶۷ فٹ ہے لیکن اندرونی طرف سے گولائی فقط ۸½ فٹ رہ جاتی ہے۔

یہ مینار لاہور کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ ۱۸۴۱ء میں جب شیر سنگھ نے قلعہ لاہور کے لیے اپنے آدمی متعین کیے تو انھوں نے انہی میناروں سے آتش بازی کر کے مہارانی چندن کور کی ڈوگرہ فوج کو شکست دی تھی۔

شیر سنگھ اور دھیان سنگھ کے قتل کے بعد سردار ہیرا سنگھ سندھانوالہ نے جب لاہور کا محاصرہ کیا تو اس نے انہی میناروں پر زنبورہ توپیں نصب کیں اور قلعے والوں کو شکست فاش دے کر خود وزیر بنا۔

مسجد کے اطراف میں چھوٹے چھوٹے بہت سے کمرے موجود ہیں[1] ان کمروں

---

[1] اب ان کی باقاعدہ مرمت کر دی گئی ہے اور ان میں حکومت پنجاب کے محکمہ اوقاف کے بعض دفاتر قائم ہیں۔ یہ کمرے بہت صاف ستھرے ہیں۔ علاوہ ازیں (محکمہ اوقاف) کی شاندار لائبریری بھی یہیں ہے۔ طلبا کی تعلیم کا بھی عمدہ انتظام ہے۔

میں وہ طالب علم جو تحصیلِ علم کی غرض سے دور دراز کے علاقوں سے آتے تھے، اقامت پذیر ہوتے تھے۔ مسجد کے نام پر جو جاگیریں وقف تھیں، ان کی آمدنی سے ان طلبا کی خورد و نوش کا بندوبست کیا جاتا تھا۔

یہ مسجد سکھوں کے دورِ حکومت میں اصطبل اور میگزین کا کام دیتی رہی ہے۔ چنانچہ جب یہ مسجد مسلمانوں کو واگزار کی گئی تو اس کا تمام فرش نجاست سے اٹا ہوا تھا۔

مسجد کا مہتممِ عمارت، جیساکہ اوپر بیان ہو چکا ہے فدائی خان کوکہ تھا۔ فدائی خان کا اصلی نام مظفر حسین ہے۔ دورِ شاہ جہانی میں اس نے نہایت دیانت اور وفاداری سے اپنے فرائض منصبی ادا کیے۔ سب سے اوّل وہ داروغہ عدالت مقرر ہوا۔ اس کے بعد وہ شاہ جہان کی طرف سے اس سفیر کے ہمراہ دکن بھیجا گیا جو عادل شاہ والیِ بیجاپور کی خدمت میں صاحبِ قرانِ ثانی کے چند تحائف پہنچانے کے لیے مقرر ہوا تھا۔

۲۳ جلوس میں وہ احدیوں کا بخشی مقرر ہوا۔ ۲۴ جلوس میں اسے چودہ سو سواروں کا منصب اور منصب داران کابل کی بخشی گری اور توپ خانے کی داروغگی عطا ہوئی۔ چنانچہ یہ خدمات وہ برابر دو سال تک نہایت تندہی سے انجام دیتا رہا۔

۲۶ جلوس میں وہ میر توزک مقرر ہوا۔ اس کے بعد وہ مختلف عہدوں پر سرفراز رہا اور اپنے فرائض خوش اسلوبی اور دیانت داری سے ادا کیے۔ ۲۹ جلوس میں وہ گرز برداروں کا داروغہ مقرر ہوا۔ جب تربیت خان قتل ہوا تو اسے میر توزک کے فرائض بھی ادا کرنے پڑے۔ ۳۰ جلوس میں شاہ جہان نے اسے فدائی خان کا لقب عطا کیا اور جب عالمگیر سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے کوکلتاش ہونے کی وجہ سے بہت ترقی کی۔

جب بادشاہ نے داراشکوہ کے تعاقب میں باغ اعزآباد میں نزولِ اجلاس فرمایا تو فدائی خان کو نقارہ عطا ہوا، اور امیر الامرا شائستہ خان کے ساتھ سلیمان شکوہ کی مہم پر نامزد ہوا۔ خان مذکور امیر الامرا سے پیشتر علاقہ بوریہ کی طرف روانہ ہوا تھا، وہاں پہنچ کر اُسے معلوم ہوا کہ میرزا سلیمان شکوہ یہ چاہتا ہے کہ پرتھی سنگھ والیِ سری نگر کی اعانت سے ہردوار سے گزر کر لاہور پہنچ جائے۔ خان مذکور بجلی کی طرح سے ہردوار پہنچا۔ اس یلغار کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرزا سلیمان شکوہ دوبارہ کوہستان سری نگر میں لوٹ آیا۔ فدائی خان دربارِ معلیٰ میں حاضر ہوا، جہاں سے اسے حکم ملا کہ وہ خلیل اللہ خان کی مدد کے

لیے جاسئے جوان وطن دارا شکوہ کا تعاقب کر رہا تھا۔ انہی ایام میں جب شاہی سواری قصور میں خیمہ زن ہوئی تو خان مذکور حسب الارشاد دربار میں حاضر ہوا، چنانچہ اسے ان خدمات کے صلے میں ارادت خان کی بجائے اودھ اور گورکھپور کی صوبے داری عطا ہوئی۔ اس کے بعد فدائی خان، شاہ زادہ سلطان محمد کے ساتھ شجاع کی مہمات پر مقرر ہوا۔

۴ جلوس میں صف شکن کی تبدیلی سے اسے میر آتشی کا بلند عہدہ عطا ہوا۔

۶ جلوس میں جب قوم سنبل نے فتنہ و فساد کی آگ بھڑکائی تو خان مذکور کے نام حکم جاری ہوا کہ وہ قوم مذکور کی گوشمالی کے لیے فی الفور کابل جائے۔ خان مذکور نے تھوڑے ہی عرصے میں اس مہم کو سر کر لیا اور اسی سال اس نے علاقے میں کلی امن و امان قائم کر کے بادشاہ سے خراج تحسین حاصل کیا، چنانچہ دوسرے ہی سال اس کا منصب چار ہزاری اور پچیس سو سوار ہو گیا۔

۱۰ جلوس میں وہ لاہور کا گورنر مقرر ہوا۔ اسی سال کابل کا گورنر فوت ہو گیا، چنانچہ وہ فی الفور پشاور پہنچا، وہاں امن و امان قائم کر کے جموں کی طرف روانہ ہوا۔ اس سال کے آخر میں جب شاہی دربار حسن ابدال میں خیمہ زن ہوا تو کابل کی گورنری کا حکم فدائی خان کے نام جاری ہوا۔ چنانچہ وہ نہایت تزک و احتشام سے اس طرف روانہ ہوا۔ افغانوں نے میدان خالی پا کر علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔ خان موصوف نے سب سے اول پشاور پر قبضہ کیا۔ پھر وہاں سے جلال آباد آیا۔ وہاں امن و امان قائم کرنے کے بعد جب واپس آ رہا تھا تو افغانوں نے اسے تین جانب سے گھیر لیا اور نہایت خوں ریز لڑائی ہوئی۔ خان مذکور نے اپنے دست راست اعزاخان کو تھانہ گندگ سے طلب کیا اور اسے اپنا ہراول مقرر کیا، افغانوں کو شکست ہوئی اور خان مذکور تزک و احتشام سے جلال آباد پہنچا اور نہایت تدبر سے کام لے کر افغانستان میں امن و امان قائم کیا۔ ان خدمات کے صلے میں بادشاہ نے اسے اعظم خان کوکہ کا خطاب عطا کیا۔

۲۰ جلوس میں دوبارہ حاضر ہوا، اور بادشاہ نے اس کی گزشتہ خدمات اور وفاداریوں سے متاثر ہو کر اسے امیر الامرا شائستہ خان کی بجائے بنگال کا گورنر مقرر کیا۔

۲۱ جلوس میں وہ بہار کی گورنری کے لیے نامزد ہوا، مگر قضا نے آن گھیرا۔ چنانچہ وہ ۱۹ ربیع الثانی ۱۰۸۹ھ کو رحلت کر گیا۔

خان مذکور کو عمارات سے دلی شغف تھا۔ اس نے لاہور میں اپنے رہنے کے لیے ایک عظیم الشان حویلی بنائی تھی جو کہ نفاست اور خوب صورتی کے لحاظ سے بے نظیر تھی اور اکثر نامدارانِ لاہور اسی میں ٹھہرا کرتے تھے۔

خان مذکور کے تین بیٹے تھے، جن میں سے ایک صالح خان تھا، جس کو فدائی خان کا خطاب ملا تھا، اور دوسرا صفدر جو ایک مدت تک گوالیار کا گورنر رہا اور تیسرے کا کوئی پتا نہیں۔

شاہی مسجد کی تاریخ بھی کچھ عجیب و غریب ہے اور مورخین کے اس کے متعلق مختلف اور متضاد بیانات ہیں۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ جس مقام پر یہ مسجد قائم ہے وہاں دراصل شہزادہ دارا شکوہ کا وہ عظیم الشان کتب خانہ تھا، جس میں زیادہ تر علم ویدانت اور سنسکرت کی کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ جب دارا شکوہ قتل ہوا تو اورنگ زیب نے وہ کتابیں دارالخلافہ اکبر آباد طلب کر کے مختلف علما اور فضلا میں تقسیم کر دیں اور کتب خانے کی عمارت کو جو ایک شوالے کی شکل میں بنی ہوئی تھی، گرا دیا اور اس کا سالمات لے کر یہ مسجد تعمیر کرائی۔ اس بیان کو اگر نظرِ تعمق دیکھا جائے تو اس میں بہت سی فروگزاشتیں پائی جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ دارا شکوہ کو سنسکرت اور بالخصوص علم ویدانت سے دلی لگاؤ تھا۔ مگر اس کا زیادہ تر قیام دہلی یا آگرہ میں رہا ہے، وہ لاہور شاذ و نادر ہی آیا کرتا تھا۔ اس کے لیے یہ کہنا کہ اس کا کتب خانہ لاہور میں موجود تھا از روئے تاریخ صحیح نہیں۔

جج محمد لطیف مرحوم اپنی تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں کہ دارا شکوہ نے اپنے دینی رہنما حضرت میاں میر کے مزار کی عمارت کے لیے یہ پتھر جمع کیا تھا۔ جب اورنگ زیب سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے یہ پتھر مسجد کی عمارت میں صرف کر دیا اور ایک سادہ سی عمارت میاں میر کے مزار پر بنا دی۔ یہ بیان بھی قیاساً غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر دارا شکوہ کو حضرت میاں میر صاحب سے دلی عقیدت تھی تو عالم گیر بھی ان کے روحانی کمالات کا معترف تھا۔ بلکہ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر بارہا اپنی عقیدت مندی اور ارادت کیشی کا اظہار کرتا تھا اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ حضرت میاں میر تیموریوں کی خانہ جنگیوں سے بہت عرصہ پہلے وفات پا چکے تھے۔ پس ایسی حالت میں یہ لکھنا کہ یہ تمام اسباب اور سامان آپ کے مزار کے لیے جمع کیا گیا تھا، کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ عالم گیر نے اسی مسجد کے لیے تمام سامان خود ہی مختلف مقامات سے جمع کیا تھا۔

حضرت میاں میر کے مزار کی عمارت کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی وضع بالکل شاہ جہانی عمارات سے ملتی جلتی ہے۔ وہی نقش و نگار ہیں، وہ رنگ آمیزی ہے جو اس دور کی مشہور ترین عمارات میں پائی جاتی ہے۔ عالم گیر کی عمارات بھی موجود ہیں، ان سے موازنہ کرنے سے یہ بات آسانی سے صاف ہو سکتی ہے۔ یہ عمارات عالم گیر کی تخت نشینی سے بہت عرصہ پہلے عالم وجود میں آچکی تھیں۔ پس ایسی حالت میں یہ لکھنا کہ بادشاہی مسجد کا تمام سامان دارا شکوہ کا جمع کردہ ہے بالکل حقیقت سے بعید ہے۔

ایک اور تاریخ کا بیان ہے کہ دارا شکوہ نے اپنے محل سے لے کر حضرت میاں میر کے مزار تک ایک سڑک سرخ پتھر کی زائرین کی سہولت اور اپنے آرام کے لیے تیار کرائی تھی اور جب عالم گیر تخت پر بیٹھا تو اس نے یہ سڑک کھدوا کر اسی سے مسجد تیار کرائی۔ یہ بیان بھی حقیقت سے بہت دور ہے اور بادشاہوں کا تراشا ہوا ایک افسانہ ہے۔ حقیقت وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ مسجد کے لیے پتھر اجمیر اور جے پور سے آیا تھا اور عالم گیر نے خاص اسی غرض کے لیے منگوایا تھا۔

علمِ حدیث میں پاک و ہند کا حصّہ

مصنف : ڈاکٹر محمد اسحاق　　مترجم : شاہد حسین رزاقی

برصغیر پاک و ہند کے مسلمان علم حدیث کو فروغ دینے میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں اور یہاں کے علما و محدثین اور ان کے قائم کردہ مکاتبِ حدیث کی تعلیم اور ترقی و اشاعت کے لیے ہر ایک دور میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے سندھ میں صحابہ و تابعین کرام کے ورود اور قدیم ترین مراکزِ حدیث کے قیام سے لے کر تعلیم و اشاعتِ حدیث کے دورِ جدید کے آغاز اور دارالعلوم دیوبند کی تاسیس تک اسلامی ہند میں حدیث کی ترویج و اشاعت اور تعلیم و ترقی کی تاریخ بڑی تلاش و تحقیق سے قلم بند کی ہے اور محدثین کے مختصر حالات اور ان کی تصانیف کے بارے میں مفید معلومات بھی درج کیے ہیں۔ علمِ حدیث اور اس کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ کتاب بہت اہم اور ضروری ہے۔

قیمت　-/۲۵ روپے

ملنے کا پتا : ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور